اُردو طنز و مزاح: مسائل اور امکانات

ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

Abstract

In this paper, the issues and prospects related to the Urdu comedy have been presented. The paper starts with an analysis of the tradition of the comic in Urdu After this, the concept of the democratic nature of comedy has been presented. Comedy is neither appreciated nor liked in autocratic or monarchic systems. Comedy can be used as a 'weapon' in pursuit of global peace and prosperity. Moreover, Urdu literary criticism too has not given due recognition to Comedy as a genre. Citations and references have been carefully arranged in the paper.

اس سے پہلے کہ طنز و ظرافت کے امکانِ تازہ اور احوالِ حاضرہ پر بات کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قصۂ پارینہ کی بازخوانی کر لی جائے___ ضروری نہیں کہ ہر قدیم قصہ سینے کے داغوں کی بہار دکھاتا ہو۔ بعض اوقات ''شگفتنِ گل'' کی داستان بھی پیش کی جاتی ہے۔ یہ ایک سو دس سال پہلے کا قصہ ہے۔ ادھر بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوتا ہے، ادھر اُردو کا ہلالِ ظرافت، مہِ کامل بننے لگتا ہے۔ گزشتہ صدی اردو طنز و ظرافت کے لیے موسمِ بہار ثابت ہوئی۔ اس بہار میں جن تخلیق کاروں کا لہو شامل ہے ان میں رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کرنل محمد خان، امتیاز علی تاج، شفیق الرحمٰن، محمد خالد اختر اور مشتاق احمد یوسفی خاص طور پر اہم ہیں۔ رشید احمد صدیقی گو ''قیدِ مقام'' سے نہیں گزرے اور کوئے یار ہی کی سیر کرتے رہے تاہم انھوں نے رہِ یار کو قدم قدم یادگار بنا دیا۔ تاج محل کا نظارہ کرنا ہوتا تو آگرے جانا پڑتا ہے، رشید احمد صدیقی کی ظرافت سے لطف اندوز ہونے کے لیے علی گڑھ کا ذہنی و قلبی سفر اختیار کرنا ضروری ہے۔ پطرس بخاری خود معلم تھے مگر انھوں نے مکتب کی کرامت اور طفلِ مکتب کی گریز پائی کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ مزاح نگاری اور زمانۂ طالب علمی ہم معنی ہو گئے ہیں۔ جب تک تعلیمی ادارے قائم رہیں گے، پطرس بخاری ظرافت کے ایک ادارے کی حیثیت سے زندہ رہیں گے۔ کرنل محمد خان کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ جنگ کے میدان میں ہیں یا کشتِ زعفران میں! وہ رزم گاہ میں بزم آرائی کے ہنر سے واقف تھے۔ وہ قربتِ مرگ میں بھی متبسم دکھائی دیتے ہیں۔ کرنل محمد خان نے ہمیں یہ بتایا کہ ''چو مرگ آید تبسم برلب اوست'' کا مفہوم مردِ مومن کے علاوہ اگر کوئی جانتا ہے تو وہ مزاح نگار ہوتا ہے۔ چچا چھکن نے تصویر تو آڑی ترچھی ہی ٹانگی لیکن طنز و ظرافت کے تصویر خانے میں امتیاز علی تاج کی رنگین تصویر ہمیشہ آویزاں رہے گی۔ شفیق

الرحمٰن نے محبت اور مزاح کا مرکب تیار کیا ہے۔ ان کے سینے میں دل اور لب پر تبسم تھا، چناں چہ وہ دل اور گل ہائے تبسم ہی پھینکا کرتے تھے۔ ان کی دل اندازی اور خندہ نوازی کو اہلِ دل اور لبِ لعلیں فراموش نہیں کر سکتے۔ محمد خالد اختر، اختر شناس نہیں تھے مگر قدرتِ حق سے انہیں مستقبل بینی کی صلاحیت عطا ہوئی تھی۔ انھوں نے بیس سو گیارہ میں ایک تباہ کن عالمی جنگ ہونے کی پیش گوئی کر رکھی ہے۔ اگر یہ پیش گوئی پوری ہوگئی تو جنگ کے انجام پر روئے ارض پر جو چیزیں زندہ باقی بچیں گی ان میں خالد اختر کے دو مضحک کردار__ چچا عبدالباقی اور بھتیجا بختیار خلجی__ ضرور ہوں گے۔ مشتاق احمد یوسفی نے ایک عالم کو زلیخا بنا رکھا ہے۔ قارئین کی نظریں خیرہ اور انگلیاں فگار ہوتی رہتی ہیں مگر جلوؤں کا کوئی شمار نہیں۔ یوسفی کی تحریریں اس شاعرانہ خیال کو پیش کرتی ہیں کہ حسن کی بھی انتہا نہیں ہوتی۔ اُردو کی ظریفانہ شاعری پر بھی یہ صدی مہربان ہی رہی۔ اکبر کے علاوہ جن دیگر اکابرین نے ظریفانہ شاعری کو درجۂ کمال تک پہنچایا ان میں سید محمد جعفری، ضمیر جعفری، دلاور فگار اور انور مسعود کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ یوں یہ صدی تبسم زیرِ لب سے خندۂ دنداں نما تک کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے اختتام کو پہنچتی ہے۔ سو سال کا عرصہ پلک جھپکنے میں نہیں گزرا کرتا۔ اس دوران میں چشمِ زماں نے کئی انقلاب دیکھے اور لوحِ زمیں پر عروج و زوال کی کئی داستانیں رقم ہوئیں۔ یہ داستانیں جو سماج، سیاست اور معاشرت کے گرد گھومتی ہیں، اُردو طنز و ظرافت پر اثر انداز ہوئیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشرے کی ذہنی تشکیل میں طنز و مزاح نے بھی غیر محسوس طور پر کردار ادا کیا۔

اب ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو رہے ہیں بلکہ اس صدی کی پہلی دہائی ختم ہونے کو ہے۔ زمانے کے انداز بدلے گئے ہیں۔ تہذیبوں کا تصادم جاری ہے۔ دنیا دہشت گردی کا شکار ہے اور عالمی امن خطرے میں ہے۔ خود ہمارے ملک میں آئے روز دھماکے ہوتے رہتے ہیں۔ خونِ ناحق بہایا جاتا ہے۔ گلشن کو آگ لگ رہی ہے۔ سیلابِ بلا نے گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے۔ آسماں سے بلاؤں کا نزول ہو رہا ہے اور زمین پر لوگ ایک دوسرے کے لیے بلائے جان بن گئے ہیں۔ اہلِ وطن آپس میں غضب ناک ہو گئے ہیں۔ ذہنی و نفسیاتی سطح پر ہم ایک غیر صحت مند قوم بنتے جا رہے ہیں۔ سیاسی و سماجی تضادات اور لسانی، مذہبی اور صوبائی تعصّبات نے عوام کو اس درجہ ناراض اور برہم کر رکھا ہے وہ ایک دوسرے کو زمین کا بوجھ تصور کرنے لگے ہیں۔

وطنِ عزیز کی سلامتی اور خوش حالی کے لیے ان نفرتوں اور رنجشوں کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اتحادِ باہمی اور اعتماد سازی کے لیے جہاں دیگر اقدامات کرنا ہوں گے وہاں ہمیں آپس میں تحائف کا تبادلہ بھی کرنا ہوگا۔ ایک دل نواز تبسم سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہوتا۔ سماجی تعلقات کی بہتری کے لیے ظرافت اہم کردار ادا کر سکتی ہے کیوں کہ ہنسنا ہنسانا ایک سماجی اور اجتماعی عمل ہے۔ تنہائی میں صرف دیوانے ہنسا کرتے ہیں۔ جس طرح روشنی، روشنی کو قطع نہیں کرتی، اسی طرح ہنسی، ہنسی کو تحریک دیتی ہے۔ کسی شخص کو بلند بانگ قہقہے لگاتا دیکھ کر ہم خود بھی مسکرا اٹھتے ہیں۔ ہنسی ایک وبا کی مانند ایک شخص سے دوسرے میں منتقل ہوتی ہے۔ ٹی وی اور تھیٹر کے اداکار اور ہدایت کار اس حقیقت سے بہ خوبی آگاہ ہوتے ہیں، اس لیے سٹیج پر مزاحیہ ڈراموں کی پیش کش کے دوران ''کرائے کے خندہ زن''

تماشائیوں کے درمیان مناسب فاصلوں پر بٹھا دیے جاتے ہیں، اسی طرح ٹی وی پر پیش کیے جانے والے شگفتہ ڈراموں میں ناظرین کو ''غیبی قہقہے'' بھی سنائے جاتے ہیں اور یوں حاضرین کو ہنسی کی ترغیب اور تحریک دی جاتی ہے۔[۱] کچھ عرصے سے قومی ٹی وی چینلز پر دکھائے جانے والے مزاحیہ اُردو ڈراموں میں بھی یہ تکنیک اختیار کی جانے لگی ہے۔

یہاں ایک واقعہ یاد آتا ہے جو نصف صدی قبل افریقہ میں پیش آیا تھا۔ کیتھولک ہائی سکول کی چند طالبات نے کسی بات پر ہنسنا شروع کیا تو ہنستی ہی چلی گئیں۔ کچھ ہی دیر بعد پورا سکول ان قہقہوں میں شامل تھا۔ بعدازاں یہ وبائے تبسم علاقے کی دیگر خواتین میں منتقل ہوئی۔ کوئی ایک ہزار خواتین اس عارضے سے متاثر ہوئیں۔ زیادہ تر خواتین تو اس درجہ محوِ تبسم ہوئیں کہ ــــ نہ کھانے کی سدھ اور نہ پینے کا ہوش!! بعض ایسی بھی تھیں کہ جن کی ہنستے ہنستے آواز بیٹھ گئی۔ ہنسنے ہنسانے کا یہ عمل دو ماہ تک جاری رہا۔[۲]

آج اُردو زبان کے طنز و مزاح نگار بھی کوئی ایسی ہی ''تحریکِ تبسم'' چلا سکتے ہیں جو کراچی سے پشاور اور گلگت سے گوادر تک خوش گوار اثرات پیدا کر سکتی ہے۔ قوم کو Comic Relief کی ضرورت ہے۔ اُردو زبان کے طنز و مزاح نگار وطنِ عزیز کے امن، اتحاد اور اطمینان میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مزاح میں جو اجتماعیت اور اتصال پذیری کی قوت ہوتی ہے، اس سے سیاسی اور سماجی سطح پر فائدہ اٹھانا چاہیے۔ امنِ عالم کے حصول کے لیے بھی یہ نسخۂ ظرافت آزمایا جا سکتا ہے۔

طنز و ظرافت میں اصلاح پسندی اور حریتِ فکر کے عناصر شامل ہوتے ہیں، اس لیے زمانۂ آمریت میں اس صنف کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ چشمِ آمر میں مزاح نگار کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ ایسی ریاستیں جو جبر اور طاقت کے زور پر قائم ہوتی ہیں، وہاں مزاح نگار کے لیے عرصۂ حیات تنگ ہوتا ہے، کیوں کہ وہ ایسی حکومتوں کے لیے محتسب کا کردار ادا کرتا ہے۔ انھیں ریاست کے لیے خطرہ خیال کیا جاتا ہے۔ ہٹلر اس خطرے سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ اس نے ''انسدادِ ظرافت'' کی عدالتیں قائم کی تھیں جو ایسے ''مجرموں'' کو سزائیں سناتی تھیں جو اپنے کتوں یا گھوڑوں کو 'ہٹلر' کے نام سے پکارتے تھے یا ایسے لطائف تراشتے تھے جن میں ہٹلر کی توہین کا پہلو نکلتا تھا۔ سابقہ سوویت یونین میں بھی مزاح نگاروں پر پابندی عائد تھی۔ صرف ''ظرافت برائے ریاست'' کی آزادی تھی چناں چہ کروکوڈل (Krokodil) کے نام سے ایک فکاہیہ ریاستی جریدہ جاری کیا گیا جس کے مقاصد میں ملک دشمنوں، رشوت خوروں، خوشامدیوں اور مغرب کے سرمایہ داروں کو نشانۂ تضحیک بنانا شامل تھا۔ آزادیٔ فکر یہاں بھی پابند نہ رہ سکی اور جریدے کے اراکینِ ادارت مقاصد سے بالاتر ہو کر پرورشِ لوح و قلم کرنے لگے، چناں چہ ایک موقع ایسا کہ 'ملازمانِ رسالہ' کو برخاست کر دیا گیا۔ امریکہ جو آج جمہوریت کا سب سے بڑا علم بردار ہے، مکارتھی (McCarthy) کے زمانے میں مزاح نگاروں کے لیے 'تفریحی مقام' نہیں تھا۔[۳] برصغیر کی تاریخ میں ایک نازک مزاج شہنشاہ نے ایک شاعر کو طنزیہ و مزاحیہ شعر کہنے کی پاداش میں قتل کرا دیا تھا۔ یہ واقعہ فرخ سیر کے زمانۂ حکومت میں پیش آیا تھا جس نے مزاح گو جعفر زٹلی کو اس لیے گردن زدنی قرار دیا تھا کہ اس نے ''سکۂ شاہی'' کی تحریفِ مضحک کی تھی۔[۴] ماضی بعید میں

افلاطون نے بھی طنز ومزاح نگاروں کے لیے جرمانے اور جلاوطنی کی سزائیں تجویز کی تھیں۔ وہ ریاست میں ظرافت نگاروں کے وجود کو مشروط طور پر ہی تسلیم کرتا ہے۔ اخلاقیات کے پردے میں افلاطون نے ظرافت کو ریاست کا تابع بنانے کی تجویز پیش کی ہے۔۵

یہ بات خوش آئند ہے کہ وطنِ عزیز میں سلطانیٔ جمہور کا زمانہ آیا ہے۔ آمریت کی طویل رات کے بعد جمہوریت کا سورج طلوع ہوا ہے___ لیکن ابھی یہ اجالا داغ داغ ہے اور سحر، شب گزیدہ!! ملک میں جمہوریت کے استحکام اور فروغ کے لیے اہلِ حکومت کو عبید زاکانی کی کم از کم ایک بات پر عمل کرنا ہوگا کہ جس نے کہا تھا کہ مزاح گو کی بات پر خفا نہیں ہوتے۔ اردو اخبارات کے فکاہیہ کالموں اور ٹی وی کے شگفتہ ڈراموں جن میں اہلِ سیاست کو نشانۂ تمسخر بنایا جاتا ہے، سے یہی تاثر ملتا ہے کہ ملک میں مزاح نگار آزاد ہیں۔ یہ بات ظرافت اور جمہوریت دونوں کے لیے نیک فال ہے اور اس امر سے یہ روشن امکان پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ سیاست اور اہلِ ظرافت کی مشترکہ ''کاوشوں'' سے بالآخر ہماری قوم جمہوریت کی حقیقی منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

اُردو طنز ومزاح کا المیہ یہ بھی رہا ہے کہ اردو تنقید نے اسے نگاہِ کم سے دیکھا ہے۔ بہت کم نقادوں نے اس پر عنایت کی نظر ڈالی ہے۔ زیادہ تر نے طنز وظرافت کو دوسرے درجے کا ادب خیال کیا ہے۔ وہ اس صنف کو محض لطفِ محفل کی چیز گردانتے ہیں۔ ابھی ان پر مونالیزا کی مسکراہٹ کے اسرار منکشف نہیں ہوئے۔ ابھی انہوں نے 'قلقلِ مینا' کی معنویت کو مکمل طور پر نہیں جانا۔ انسانی قہقہہ، ان کے لیے صرف ایک 'آواز' ہے۔ یہ 'آواز' کہاں سے آ رہی ہے، ابھی اس کا سراغ لگانا باقی ہے۔ اس حوصلہ شکن صورتِ حال میں قدمائے ظرافت اپنے زورِ دروں سے بلند تر ہوئے تھے۔ تازہ واردانِ ظرافت کو بہرحال___ کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے! اہلِ نقد کی توجہ، تحسین اور تشویق اس صنفِ لطیف کے فروغ، وسعت اور ہمہ گیری میں اضافہ کر سکتی ہے اور پھر عجب نہیں کہ رواں صدی کے اختتام پر آسمانِ ظرافت پر کچھ ایسے ستارے چمک رہے ہوں جن کے نام تو کچھ اور ہوں مگر ان کی آب وتاب قدیم ستاروں کی سی ہو۔ ان ستاروں سے بھی ویسی ہی روشنی نکلتی ہو جو رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، کرنل محمد خان، امتیاز علی تاج، شفیق الرحمٰن، محمد خالد اختر اور مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں سے نمودار ہوتی ہے:

ہم روحِ سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آ جائیں گے ہم لوگ

حواشی:

۱۔ John Morreall, Taking Laughter Seriously, State University of New York Press, 1983, p. 114

۲۔ Ibid, p. 115

۳۔ Ibid, p. 102

۴۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس حوالے سے تحریر کیا ہے:

''میر جعفر زٹلی نے ہجو، طنز اور زٹل کے ذریعے اس معاشرے کو متوجہ کرنے اور زوال کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ اس سطح پر اس نے کسی کو نہیں بخشا۔ فرخ سیر تخت پر بیٹھا تو اس نے بادشاہ کا ''سکّہ'' یوں لکھا:

سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
پادشاہے تسمہ کش فرخ سیر

یہ سکّہ سچائی کی آواز تھا، خزانہ خالی تھا، بدنظمی اور فسادات کا دور دورہ تھا اور معاشی حالات ابتر تھے۔ ایسے میں بادشاہ اپنا سکّہ جاری کرنے کے لیے سونا چاندی کہاں سے لاتا۔ ظاہر ہے ایسے دور میں ''گندم و موٹھ و مٹر'' پر ہی سکّہ جاری کیا جا سکتا تھا۔ فرخ سیر تک یہ سکّہ پہنچا تو اس نے جعفر زٹلی کو قتل کرا دیا۔''

تاریخِ ادبِ اُردو، جلد دوم، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، ص: ۶۴۱

۵۔ افلاطون نے ایتھنز کے اجنبی کے پردے میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا:

''.....لیکن ہماری ریاست میں طنز و مزاح نگاروں کا کیا بنے گا جو پورے انسانوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ نیک نیتی اور بڑے سلیقے سے ہمارے شہریوں کی ہنسی اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا ہمیں دل لگی اور دل جمعی سے کہی ہوئی باتوں میں امتیاز کر کے غصے کے بغیر مذاق میں کسی مقصد کے تحت تضحیک کی اجازت دینی چاہیے۔ ہم اس معاملے میں سنجیدگی یعنی ایسے جذبے کی اجازت نہیں دیں گے جو مستقل ہو اور تبدیل نہ کیا جائے۔ تاہم ہمیں طے کرنا ہوگا غیر مجرمانہ تضحیک کے لیے کسے اجازت دی جائے اور کسے نہیں۔ مزاحیہ شاعر یا طنز نگار کو اجازت نہیں ہوگی کہ وہ کسی شہری کی الفاظ یا نقل کے ذریعے غصے میں یا یونہی ہنسی اڑائے۔ اگر کوئی خلاف ورزی کرتا ہے تو منصفین یا تو

اسے فوری طور پر جلاوطن کر دیں گے یا اسے تین نقری سکوں کا ہرجانہ ادا کرنا ہوگا، جو اس دیوتا کی نذر کر دیا جائے گا جو کھیلوں کے مقابلے کی نگرانی کرتا ہے۔ جن کو اجازت ملے گی وہی ایک دوسرے سے متعلق نظمیں کہہ سکیں گے جو غصے میں نہیں کہی جائیں گی اور ان کا مقصد محض مذاق ہوگا۔ اس اجازت کا غصہ اور سنجیدگی سے کہے ہوئے کلام پر اطلاق نہیں ہوگا۔ ان امور کے فیصلے کی ذمہ داری نوجوانوں کے عام تعلیم کے نگران پر عائد ہوگی اور وہ جس تحریر کی بھی اجازت دے گا مصنف وہی لکھے گا اور جس کی اجازت نہیں ہوگی وہ کہیں پیش نہیں کرے گا اور نہ کسی کو پڑھائے گا۔ خواہ وہ آزاد شہری ہو یا غلام۔ اس کی خلاف ورزی کی صورت میں اس کی تحقیر کی جائے گی اور وہ خلافِ قانون عمل کا مرتکب قرار پائے گا۔''

مکالماتِ افلاطون (قوانین)، جلد چہارم، عبدالحمید اعظمی (مترجم) اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۸ء، ص: ۳۵۹، ۳۶۰

II